تاثرات

(خلیل مامون)

مبصر: ڈاکٹر صغیر افراہیم

خلیل مامون کی شاعری برصغیر کے ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور اب ان کی نثری تحریروں کا ایک انتخاب 'تاثرات' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں تین تاثراتی مضامین گیارہ تبصرے، چار تجزیے اور تین تراجم شامل ہیں۔ اس سے یہ بات تو واضح ہے کہ خلیل مامون مختلف اصناف سخن پر ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں۔ ان کی نثری تحریروں کا فکری پس منظر توجہ طلب ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ فلسفہ کے طالب علم رہے ہیں اور عمر کا بیشتر حصہ انتظامی امور میں گزرا ہے۔ جہاں لفظ کی بہت اہمیت ہے۔

خلیل مامون کو شروع سے ہی فنون لطیفہ خصوصاً شاعری سے دلچسپی رہی ہے جس کا ذکر ان کی تحریروں میں اکثر ملتا رہتا ہے۔ زیر نظر کتاب (تاثرات) کی تمام نگارشات ۱۹۷۲ء سے ۲۰۰۰ء کے درمیانی عرصے پر محیط ہیں۔ باقی کے ''حرف معتبر'' پر لکھا گیا تجزیہ ان میں قدیم تر ہے۔ مذکورہ تمام مضامین کی اہمیت کا اعتراف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''......مضامین میرے بکھرے بکھرے خیالات کا آئینہ ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ مضامین ادھورے اور تشنہ ہیں لیکن جن سوالات کو ان میں اٹھایا گیا ہے ان پر ذکر و فکر ہر سوچنے والے کے لیے ضروری ہے۔'' ص ۵

''تاثرات'' میں شامل پہلا مضمون ''تنقید کا مفہوم'' ہے جس میں یہ نکتہ اُجاگر کیا گیا ہے کہ تخلیق اور تنقید ایک ہی حرکی نظام کے دو مختلف پہلوؤں کی صورت میں روبہ عمل ہوتے ہیں۔ پھر ''انسان، انفرادیت اور شناخت'' پر مدلل بحث کی گئی ہے۔ تیسرا تاثر اردو شعر و ادب کے گذشتہ پچاس برسوں پر مشتمل ہے، جس میں ترقی پسندی بھی ہے جدیدیت بھی اور مابعد جدیدیت بھی اور جس کے المیے کو وہ ان الفاظ میں اُجاگر کرتے ہیں:

> ''ہمارے ناقدوں اور مدیروں نے علم، مشاہدہ اور تجربات کے دروازے اس طرح لکھنے اور پڑھنے والوں پر بند کر رکھے ہیں کہ جس طرح ہمارے آج کے مذہبی پیشواؤں نے مذہبی مقتدیوں پر اجتہاد کے دروازے بند کر دیے ہیں۔'' ص ۱۲

تبصروں میں پہلا تبصرہ جبار جمیل کی نظموں کے مجموعہ ''تنہائی'' پر ہے۔ خلیل مامون کے مطابق ''یہ نظمیں آج کل لکھی جانے والی بیشتر نظموں اور موضوعات سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کی خوبی ان کی انفرادی شعری صداقت میں مضمر ہے۔'' انہوں نے نظم 'زیاں' کو موضوع بحث بناتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نظم میں وقت اور انسان کی باہمی خلاقیت کو جس زاویہ سے پیش کیا گیا ہے اس سے نہ صرف نیا احساس پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ تاثر بھی ابھرتا ہے کہ ''زیاں'' نہ ختم ہونے والا دائمی احساس ہے۔ 'لفظوں کی تجارت'، ''کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے'' اور ''خدا

مجھے معاف کرے'' کو مجموعے کی بہترین نظم قرار دیا گیا ہے۔ 'لفظوں کی تجارت'' میں فطرت، تاریخ، انسانی تعلقات کا المیہ اور شاعر کی ذات ایک وسیع لیکن پُر اسرار کائنات کا پس منظر بن گئے ہیں۔ یہ مکمل نظم بہاؤ کے اظہاریے کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں فکری تجربے کو اظہار سے میّز نہیں کیا جا سکتا۔ ''کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے'' میں حال سے ماضی تک جانے اور وہاں سے یادوں کے خوشگوار جہاں تک پہنچنے اور پھر ہوش و جنوں کی دنیا سے الگ ہونے کا جامع اظہار ہے۔ ''خدا مجھے معاف کرے'' میں اذان کے ظہور کا کھڑکیوں اور دیواروں سے ٹکرا کے واپس ہو جانا اہم نہیں بلکہ سماعت کی شاخوں کا سحر بلالی کے پھولوں کی راہ تکنا اہم ہے۔ مجموعے کی دیگر نظموں کو انہوں نے روایتی یا موضوعاتی قرار دیا ہے اور یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ان کی اچھی نظمیں ۱۹۷۲ء کے سوغات کے شمارے میں چھپی تھیں۔ اس کے بعد ''جبار جمیل کی شعری بصیرت اور تخلیقی توانائی میں اضافے کے بجائے کمی واقع ہوئی ہے۔ اس کی وجہ کچھ بھی ہو جبار جمیل کو خود اپنی نظموں کے تناظر میں اپنی دوسری شعری تخلیقات کا جائزہ لینا چاہیے اور اس آئینے میں انھیں اپنا تخلیقی سفر نئی توانائی کے ساتھ پھر شروع کرنا چاہیے۔'' ص ١٦ یہ تبصرہ روایتی نہیں ہے بلکہ خلیل مامون کی تنقیدی بصیرت کو خاطر نشان کرتا ہے۔

دوسرا تبصرہ حامد اکمل کے پہلے شعری مجموعے ''تطہیر'' پر ہے۔ اس مجموعے میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔ مجموعے کی محض ایک نظم کو چھوڑ کر سبھی نظموں اور غزلوں پر انہوں نے سخت گرفت کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ حمد، نعت، مناجات اور دعا کو بھی پڑھ کر مایوسی ہوتی ہے کہ تمام تخلیقات میں کوئی معنوی ربط نہیں ہے اور نہ ہی ان میں کوئی شعریت اور انوکھا خیال ہے بلکہ ان کے مطالعے سے ایسا لگتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں خود یہ واضح نہیں ہے کہ وہ کیا کہنے جا رہا ہے اور اسے کس طرح کہنا چاہیے۔

تیسرا تبصرہ ''جزیرۂ اُمید کا'' ہے۔ ریاض احمد خمار کے اس مجموعۂ کلام میں غزلیں اور پابند نظمیں ہیں۔ پیش لفظ کے طور پر حمید الماس لکھتے ہیں:

> ''اِس شعری مجموعے کی غزلوں کے تجزیاتی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں روایت کے پہلو بہ پہلو شاعر کی ذہنی اپج شامل ہے۔''

خلیل مامون پیش لفظ کے توسط سے لکھتے ہیں:

> ''.....اول تو یہ کہ غزلوں کا تجزیہ خود صاحب مضمون نے نہیں کیا تو نتیجہ پر کس طرح پہنچے۔ دوم: روایت کے پہلو بہ پہلو شاعر کی ذہنی اپج سے کیا مطلب ہے؟ یعنی دوسرے لفظوں میں روایت میں رہتے ہوئے کیا ذہنی اپج غیر ممکن ہے؟ لہٰذا مضمون نگار کے بیان کی صداقت مشکوک ہے کیونکہ اس مجموعے میں شامل غزلوں میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ جس میں روایت سے کوئی نیا خیال یا نیا انقلاب اُبھر رہا ہو۔'' ص ۴۲

اکرم نقاش کے شعری مجموعے ''شعر'' پر حامد کاشمیری کا تعارفی نوٹ خلیل مامون کو بے جا مروت کا زائیدہ نظر آتا ہے:

> ''شاعری کی موجودہ صورت حال کے پس منظر میں یہ لازمی ہے کہ ہمارے نام نہاد نقاد ایسی پیش گوئیاں کرنے اور ایسے بیانات صادر کرنے کا کام چھوڑ کر نئے لکھنے والوں کو صحیح مشورہ دینا سیکھیں تاکہ لکھنے والوں اور ناقد دونوں کی ادبی عاقبت سُدھر سکے۔'' ص ۴۸

خلیل مامون صرف نقاد کو ہی مورد الزام نہیں ٹھہراتے بلکہ وہ یہ بھی بے باکانہ انداز میں لکھتے ہیں کہ اس مجموعہ میں شامل غزلوں کو بار بار پڑھنے کے باوجود کوئی شعر نہ تو دل کو موہ لیتا ہے اور نہ ہی چونکاتا ہے اور نہ ہی اشعار کے مطالعہ سے شاعر کے خیالات اور اس کے مزاج اور اسلوب کا پتہ چلتا ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ شاعر کے پاس لکھنے کے لیے بہت کم مواد اور تجربات کا فقدان تھا لہٰذا کلام کو بے اثر ہونا ہی تھا۔

لطیف ؔ کے شعری مجموعے جس میں ۴۹ نظمیں اور پانچ غزلیں شامل ہیں، اس پر کچھ یوں رقمطراز ہیں کہ لطیف ؔ اپنی تخلیقات کو خود اپنے خیال کے آئینے میں اس وقت تک دیکھتے رہیں کہ جب تک اس میں داخلی اور خارجی ربط پیدا نہ ہو جائے۔ وہ اس جانب بھی شاعر کی توجہ مبذول کراتے ہیں کہ کلام میں آہنگ کی درستگی بھی ضروری ہے اور یہ بھی لازم ہے کہ نظم مکمل طور پر وزن میں ہو یا پھر مکمل طور پر نثر میں۔ ایسا کرنے سے نظموں کی قرأت اور ان کی ترسیل میں آسانی ہو سکتی ہے۔

سلیم زاہدؔ کی نثری نظموں کے مجموعے ’نرم رو‘ کو اغلاط کا مجموعہ قرار دیتے ہیں پھر حمید الماس کے پیش لفظ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ادب کا کوئی معمولی اور مبتدی طالب علم بھی نثری نظم کے تعلق سے ایسی باتیں نہیں کہے گا جو حمید الماس نے کی ہیں۔ یہی حال سلیم زاہد کے نظم نما ٹکڑوں کے بارے میں اُن کے اظہارات کا ہے۔ اس پیش لفظ کو پڑھ کر سفید جھوٹ کیسے بولا جاتا ہے اس کا عملاً مشاہدہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس تبصرہ میں نام نہاد ادیبوں، شاعروں اور نقادوں سے بڑی حد تک متنفر نظر آتے ہیں:

’’ایسی کتابوں کی اشاعت نہ صرف یہ کہ لکھنے والوں کے مال و متاع کا اسراف ہے بلکہ اس عمل میں شامل تمام افراد کے وقت کا زیاں بھی ہے‘‘ ص ۳۴

ناصر بغدادی کے سہ ماہی رسالہ ’بادبان‘ کے پہلے شمارے پر تبصرہ کرتے ہوئے منٹو، عسکری، قاسمی اور ساختیات پر اپنی رائے دیتے ہوئے احمد ہمیش کے انٹرویو کو سخت نشانہ بناتے ہیں۔ اسی طرح اسلوب احمد انصاری کے تبصرہ پر نہایت تیکھا لہجہ اختیار کرتے ہیں:

’’......تبصرہ نہ ہوتے ہوئے ’ہجو‘ بن کر رہ گیا ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ آل احمد سرور ایک کم مایہ شخصیت ہیں جنھوں نے ایک کم مایہ سوانح تحریر کی ہے۔ یہ تبصرہ نہیں ایک طرح کی کردار کشی ہے۔ اس سے لکھنے والے کا سفلہ پن بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ص ۳۷

اس تبصرے کے آخر میں ظفر اقبال کو ایک مخلصانہ مشورہ بھی دیتے ہیں:

’’......ہاں ظفر اقبال سے گزارش ہے کہ وہ کسی ’طریقہ‘‘ سے شاعری کرنا بند کر دیں اور اردو کی موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلوں پر احسان عظیم فرمائیں۔‘‘ ص ۳۸

خلیل مامون نے مضامین کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ تبصرے الف کے بعد تجزیے ہیں۔ پہلا تجزیہ ’’اختر الایمان‘‘ پر ہی ہے جس کی بابت تجزیہ نگار کا کہنا ہے کہ جیسی زندگی اور اس زندگی کے موجود اور لاموجود تعلقات اور رشتے ہیں اور جیسی بے ربط اور بے معنی اُن کی نوعیت ہے اُسے اختر الایمان نے جوں کا توں پیش کیا ہے اسی لیے اُن کی شاعری کو پڑھنے کے بعد قاری کے یہاں جو واحد تاثر اُبھرتا ہے وہ انسان کی زندگی کی فرومائیگی اور بے معنی پن کا ہے۔

باقی کے مجموعۂ کلام ’’حرف معتبر‘‘ اور کاوش بدری کے ’’کن فیکون‘‘ کے تعلق سے اُن کی رائے یہ ہے کہ دونوں کی غزلوں میں

کلاسیکی اور جدید رنگ ایک دوسرے میں ایسے گھل مل گئے ہیں کہ انھیں علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تبصروں میں ''سات سماوات'' (عرفان صدیقی) اور ''چوتھا آسمان'' (محمد علوی) خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ ''سات سماوات'' کے دیباچہ میں جو حضرت علیؓ کا قول (نہج البلاغہ کے پہلے خطبے کا حصہ) درج ہے اس سے خلیل مامون نے کام لیتے ہوئے کائنات کے تغیر و تبدل پر روشنی ڈالی ہے:

> ''عرفان صدیقی کی شاعری میں غزل کی روایت، غزل کی لفظیات شعری اور غزل کے آہنگ کے ساتھ ساتھ ایک ایسے جہاں کا منظر نامہ خلق کیا گیا ہے جو جدید تر انسان کے احساس کا جہاں ہوتے ہوئے بھی تاریخ کے تسلسل سے ابھرتا ہے۔ خصوصاً ہماری اپنی روحانی تاریخ سے۔ اس اعتبار سے عرفان صدیقی کی شاعری صحیح معنوں میں، جدیدیت کے ٹھوس عوامل اور ٹھوس احساسات کی شاعری بھی ہے۔ ان کے ہاں ایسے علامیوں کی خوبصورت بازیافت ملتی ہے جن سے ہماری مذہبی و روحانی روایات کا گہرا رشتہ ہے'' ص ۴۷

اسی طرح محمد علوی کے چوتھے مجموعۂ کلام ''چوتھا آسمان'' کو سراہتے ہوئے 'گھر' کے استعارے کی بیحد تعریف کی ہے۔

تاثر، تجزیہ اور تنقید کے مثلث کے گرد ابھرنے والے احساس کو خلیل مامون نے ''ایک چادر میلی سی'' میں موضوع بحث بنایا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ویسے تو ناول کا زمانہ جدید ہندوستان سے جڑا ہوا ہے اور اس کا مقام و مکان پنجاب کے ایک قصبہ کوٹلہ تک محدود ہے اور پلاٹ سکھوں کے سماج کے گرد گھومتا ہے تاہم جن عمومی عوامل کی طرف بیدی نے عکاسی کی ہے وہ کسی بھی دیہی علاقہ پر صادق آسکتے ہیں۔ یہ پہلو اس ناول کو غیر مکانی اور غیر زمانی کیفیت عطا کرتا ہے۔ خلیل مامون نے اپنے مضمون میں اس پر بھی زور دیا ہے کہ بیدی نے مذکورہ ناول میں انسانی رشتوں کی فعالیت انسانی ذات اور یادوں کی عکاسی کے دوران علم النساء اور اشٹم کے چاند کے بھید نہایت فنکارانہ ڈھنگ سے کھولے ہیں جس میں فلسفہ طرازی اور تحلیل نفسی سے کام لیا گیا ہے۔

روایتی طور پر میں مضمون کو اس طرح ختم کرسکتا تھا کہ مذکورہ مجموعہ جسے 'تاثرات'' کا نام دیا گیا ہے مستحسن اور قابل مبارکباد ہے لیکن تبصرے کے لیے مجھے یہ مختصری کتاب استاد مکرم پروفیسر شہریارؔ نے دی تھی لہٰذا اس پر رسماً تبصرہ نہیں ہونا چاہیے پھر خلیل مامون کی شخصیت اور ان کی تحریروں کا میں دلدادہ ہوں مگر تاثر یا تبصرہ کے بھی کچھ ضوابط ہیں۔ اس میں ذاتی پسند و ناپسند کے کوئی معنی نہیں۔ اس لیے لکھتے وقت جو اصول مجھ پر نافذ ہیں وہی 'تاثرات' کے خالق پر بھی صادر آتے ہیں۔ آیئے ذرا اس روشنی میں بھی مجموعے کو دیکھ لیں۔

خلیل مامون کے تاثرات/تبصرے پڑھ کر میرا تاثر یہ ہے کہ وہ بیشتر کتابوں کے خالق سے مطمئن نہیں ہیں بلکہ کہیں کہیں تو تحریر حد درجہ جارحانہ ہوگئی ہے۔ اچھے تبصرے اور تنقید کی خوبی یہ ہے کہ وہ Equilibrium پر کھڑی ہو کر نشیب و فراز کا مطالعہ کرے۔ میری مراد یہ ہے کہ مثلاً آپ کے سامنے تعمیر شدہ پل ہے اور آپ پل کے اوپر بیچوں بیچ کھڑے ہیں۔ پل کے دونوں اطراف آپ بیک نظر دیکھ سکتے ہیں تب اندازہ ہوگا کہ پل کے دونوں جانب کی ڈھلان متوازن ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوگا کہ دونوں طرف کی ڈھلانوں کے ستون اور Tieing Ropes اپنی اپنی جگہ پر بقدر ضرورت کسے ہوئے اور مستحکم ہیں اور جہاں نہ ہوں اس کی نشاندہی کرنا ہے ورنہ پل کے ٹوٹنے کا خدشہ ہے۔ خلیل مامون Equilibrium پر کھڑے ہو کر بلندی سے مشاہدہ کرتے ہیں یا پل کے نیچے کھڑے ہو کر تکتے ہیں اور نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ بعض بعض کتابوں کو ناقص قرار دے کر تخلیق کار کے Demolition کا اہتمام کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے چند مذکورہ بالا مشوروں اور تبصرانی

جملوں کو پھر سے ملاحظہ فرمائیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ ان کی اپسند ناپسند پہلے سے طے شدہ ہے۔ حامدی کاشمیری کے تعارفی کلمات پر یہ کہنا کہ ’’نقاد نئے لکھنے والوں کو صحیح مشورہ دینا سیکھیں تا کہ دونوں کی ادبی عاقبت سدھر سکے۔‘‘ (اکرم نقاش کا شعری مجموعہ ’شعر‘)۔ حمید الماس کے پیش لفظ کو پڑھ کر ’سفید جھوٹ کیسے بولا جاتا ہے اس کا عملاً مشاہدہ ہو جاتا ہے۔‘‘ (سلیم زاہد کا مجموعہ ’نرم رو‘)۔ اسلوب احمد انصاری کے بارے میں یہ کہنا کہ ان کا آل احمد سرور پر تبصرہ ’تبصرہ‘ نہیں ایک طرح کی کردار کشی ہے اس سے لکھنے والے کا سفلہ پن بھی ظاہر ہوتا ہے‘‘ یا ظفر اقبال کے بارے میں یہ رائے دینا کہ ’’ وہ کسی طریقے‘ سے شاعری کرنا بند کر دیں اور اردو کی موجودہ اور آئندہ نسلوں پر احسان عظیم فرمائیں۔‘‘ ---- آپ نے ملاحظہ فرمایا خلیل مامون کے لہجہ اور تیور کو۔ یہ لب و لہجہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ وہ پہلے سے ہی Biased ہیں جن کے لیے تعریفی کلمات ادا ہوئے ہیں وہ تنقیدی رسمیات کے طور پر ادا ہوئے ہیں۔ ہاں ایک چادر میلی سی کے بارے میں خلیل مامون سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے اب بیدی کا مقام تنقید و تنقیص سے بالاتر ہے ان کے ہم عصروں کو بھی بیدی پر اظہار خیال کرتے وقت سنبھل کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ ایک بار منٹو نے ان کے کسی افسانے پر رائے دیتے ہوئے کہا تھا۔ ’’تم سوچتے زیادہ ہو، لکھتے کم ہو‘‘ بیدی نے اس کا بڑا نہیں ملا بس ایک سطر جواب لکھ بھیجا۔ ’’اور تم سوچتے کم ہو لکھتے زیادہ ہو‘‘ بیدی کی یہ رائے ممکن ہے افسانہ نگاروں یا تخلیق کاروں کے لیے زیادہ قابل غور نہ ہو مگر تنقید نگاروں، تبصرہ نگاروں پر بیدی کے ان الفاظ کا اطلاق زیادہ ہوتا ہے۔ فن پاروں اور مضامین کو پڑھ کر سوچنا، متن پر غور و خوض کرنا۔ اس کی معنی خیزی اور سطحیت پر اظہار رائے کے لیے اپنا ذہن بنانا، منفی و مثبت پہلوؤں کو کھنگالنا۔ پھر ان کے کم و بیش کو اُجاگر کرتے وقت استدلالی طریقہ کار اختیار کرنا مبصرین و ناقدین کی ذمہ داری ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ یہ تبصرے ’سوغات‘ اور ’ادب‘ کے لیے بیسویں صدی کی آخری دو تین دہائیوں میں مختلف موقعوں پر لکھے گئے ہیں جب دفتر میں برائے تبصرہ کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا، پھر تخلیق کاروں کا دباؤ، ایسے میں ارکان ادارت جھلاہٹ کا شکار ہوتے ہوں گے۔ ممکن ہے خلیل مامون کی بعض آرا جھلاہٹ کا نتیجہ ہوں۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ خود تخلیق کار ہیں۔ ان کی شناخت ایک منفرد لب و لہجہ کے شاعر کی حیثیت سے قائم ہو چکی ہے چنانچہ خلیل مامون کا میدان عمل تخلیق کی دنیا ہے اور تبصرہ ایک اضافی عمل۔ کبھی کبھی تخلیق کار کو غیر تخلیقی تحریر سپرد قلم کرنے سے اُلجھن ہوتی ہے مگر مجبوراً لکھنا پڑتا ہے یعنی بیدلی سے۔ اس لیے بیشتر تبصرے سرسری اور رواروی میں لکھے گئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں نقاط نظر کی وضاحت کم کم ہوتی ہے جن کی بنیادوں پر کھرے اور کھوٹے کا فیصلہ کرتے ہیں اور ایسا نہ ہونے کی صورت میں تبصرہ غیر مدلل ہو جاتا ہے۔ چلیے تبصرے میں سرسری انداز کو قبول کر بھی لیں مگر تنقید میں تو شواہد اور دلائل کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی کہ عدالت میں ہوتی ہے۔ ادب میں تو قارئین کی عدالت ہی Supreme ہے۔ ممکن ہے ان میں سے کچھ تبصرے جو محض اطلاعاتی ہیں اور ان کی کوئی خاص نہج نہیں ہے قارئین کو اس لیے پسند آئیں کہ خلیل مامون کی زبان و بیان میں ایک خاص لطف ہے جو بیشتر ناقدین کے یہاں نہیں ہوتا۔ عموماً ناقدین تخلیق کار نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں زبان کی چاشنی یوں بھی نہیں ہوتی اور جن میں ہوتی ہے ان کے اندر یا تو کبھی فنکار بھی رہا ہو گا یا آرٹ کے جرثومے پہلے سے پوشیدہ رہے ہوں گے جو بعد کے مراحل میں نمو کرتے ہیں۔ ایسی مثالیں ہمارے یہاں بہت ہیں۔

’تاثرات‘ کے مصنف خلیل مامون سے اتنی سی استدعا ہے کہ وہ تخلیق کاروں کے لیے ہمدردی کا جذبہ رکھیں کہ حوصلہ افزائی اور نیک خوئی بھی ادب کے فروغ میں اہم کردار نبھاتے ہیں۔

لے: اصل نام خلیل الرحمٰن ہے۔ ۲۷/ اگست ۱۹۴۸ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۵ء میں دہلی یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم اے کیا، اور اسی سال آل انڈیا ریڈیو میں اسٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ روزنامہ اردو سالار کے جوائنٹ ایڈیٹر رہے۔ دو سال بعد آئی پی ایس میں سلیکشن ہوا۔ محکمۂ پولیس کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے ہوئے ادبی مشاغل میں مشغول رہے۔ بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ مضامین کے علاوہ کئی اہم ترجمے کیے ہیں۔ انٹرویو کو گفتگو کا ایک نیا اور موثر انداز دیا ہے۔ آج کل کرناٹک اردو اکاڈمی کے چیئرمین ہیں۔